چھ خطبات

ایک حوالہ کی تلاش میں پُرانے کاغذات اُلٹ پلٹ رہا تھا کہ ان میں خطبات کا ایک مسودہ ملا۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ یہ خطبات کب لکھے تھے اور ان کے مخاطب کون تھے۔ قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کوئی بیس بائیس برس اُدھر کی بات ہے اور ان کا عام فہم اور سلیس اندازِ بیان اشارہ کناں ہے کہ انہیں یا تو متوسط درجہ کے طلباء کے لئے لکھا گیا تھا اور یا کم تعلیم یافتہ طبقہ کے لیے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، ان کی اشاعت کہیں نہیں ہوئی۔ مُرورِ زمانہ کے باوجود، ان کی افادی حیثیت میں کچھ فرق نہیں آیا، اس لئے میں نے مناسب سمجھا ہے کہ انہیں پیشِ خدمت قارئین کر دیا جائے۔

پہلا خطبہ:

قال اللہ تعالیٰ: اَتَسۡتَبۡدِلُوۡنَ الَّذِیۡ هُوَ اَدۡنٰی بِالَّذِیۡ هُوَ خَیۡرٌ ؕ (2:61)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کیا تم اُس چیز کو جو بہت گراں قیمت ہے اس چیز کے بدلے میں دے دینا چاہتے ہو جو انتہائی پست درجے کی ہے؟

برادرانِ عزیز! اگر آپ بازار میں کسی شخص کو دیکھیں کہ وہ سو روپے کی سونے کی انگوٹھی دس روپے میں بیچ رہا ہے تو آپ کے دل میں پہلا خیال یہ گزرے گا کہ یہ انگوٹھی اس کی اپنی نہیں۔ چوری کی ہے۔ اسی لئے یہ اُسے اتنے سستے داموں فروخت کر رہا ہے۔ پنجابی زبان میں ایسے موقع پر کہتے ہیں کہ ''چوراں دے کپڑے تے ڈانگاں دے گز۔'' جب چوری کا کپڑہ بکتا ہے تو اسے

عام گزوں سے نہیں ماپا جاتا۔اس کی پیمائش اُن گزوں سے کی جاتی ہے جن کی لمبائی لٹھ بھر کی ہو۔

لیکن اگر آپ کو اس کا بھی یقین آجائے کہ وہ انگوٹھی چوری کی نہیں۔اُس شخص کی اپنی ہے۔تو پھر آپ اس کے سوا کسی نتیجے پر نہیں پہنچیں گے کہ وہ شخص پاگل ہے۔کوئی سمجھدار آدمی ـــــ کوئی صاحبِ عقل وہوش ـــــ سو روپے کی چیز دس روپے میں نہیں بیچتا۔آپ جس سے بھی اس بات کا ذکر کریں گے وہ بلا تامل کہہ دے گا کہ وہ شخص فی الواقعہ پاگل تھا۔

لیکن جو لوگ اُس شخص کو پاگل کہتے ہیں انہوں نے کبھی اپنی حالت پر غور نہیں کیا اور سوچا نہیں کہ وہ خود صبح سے شام تک کتنی مرتبہ اس قسم کے پاگل پن کی حرکتیں کرتے ہیں۔وہ اپنی کتنی گراں بہا چیزوں کو کتنے سستے داموں فروخت کرتے ہیں۔آپ شائد حیران ہوں گے کہ وہ کون سے لوگ ہیں جو اس قسم کے پاگل پن کی حرکتیں کرتے ہیں؟ وہ کون سی بستیاں ہیں جن میں یہ لوگ رہتے ہیں؟ اگر آپ سے کہہ دیا جائے کہ وہ ہم میں سے ہی ہیں۔اور ہماری ہی بستیوں میں بستے ہیں،تو شاید آپ اسے صحیح تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہوں ـــــ لیکن یہ بات ہے بالکل صحیح۔اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔سنئے کہ یہ کس طرح صحیح ہے!

ہمارے ہاں ایک عام محاورہ ہے ـــــ اور میرا خیال ہے کہ آپ میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہو جس نے اس محاورہ کا کبھی نہ کبھی استعمال نہ کیا ہو۔یا کم از کم اسے سُنا نہ ہو۔وہ محاورہ یہ ہے کہ ؎

مال صدقۂ جان، جان صدقۂ آبرو

آپ سمجھے کہ اس کا مطلب کیا ہے؟ مطلب بالکل واضح ہے۔مال ودولت اچھی چیز ہے۔اس سے دنیا میں انسان کے بہت سے کام نکلتے ہیں۔اس سے ضروریات پوری ہوتی ہیں۔اس سے انسان کھانے پینے کی چیزیں خریدتا ہے۔بیمار ہو تو علاج کراتا ہے۔ڈاکٹر کی فیس دیتا ہے۔دوائیاں خرید کر لاتا ہے۔کپڑے بنواتا ہے۔بچوں کو تعلیم دلواتا ہے۔یہ سب کچھ پیسے کے زور پر ہوتا ہے۔ہمارے ایک پرانے شاعر نے کہا ہے کہ ؎

پیسہ نہ ہو تو آدمی چرخے کی مال ہے

اس لئے دنیا میں پیسے کی بڑی قدر ہے۔جو شخص پیسہ سنبھال کر رکھتا ہے اسے ہر شخص عقلمند کہتا

ہے۔ جو پیسہ برباد کرتا ہے اُسے بیوقوف کہا جاتا ہے۔لیکن زندگی میں ایسے وقت بھی آجاتے ہیں کہ جو شخص اس وقت پیسہ خرچ نہیں کرتا، اُسے سنبھال کر رکھتا ہے۔ ساری دنیا اس پر لعنت بھیجتی ہے۔ مثلاً ایک شخص کا بچہ بیمار ہے۔ اس کی حالت نازک ہو رہی ہے۔ اس شخص کے پاس بہت سارو پیہ جمع ہے۔لیکن وہ اپنے بچے کے علاج پر کچھ خرچ نہیں کرتا۔ کبھی وہ اسے محلے کے عطار کے پاس لے جاتا ہے کہ دو پیسے کے شربت میں کام بن جائے۔ کبھی وہ کسی عامل کے پاس چلا جاتا ہے کہ اس کی جھاڑ پھونک سے فائدہ ہو جائے۔ بچے کی حالت دن بدن خراب ہوتی جاتی ہے۔ ساری دنیا اُسے کہتی ہے لیکن وہ اس کے علاج پر پیسہ خرچ نہیں کرتا۔ بالآخر بچہ جان دے دیتا ہے۔ سوچئے کہ کون ہے جو ایسے دولتمند باپ پر لعنت نہیں بھیجے گا؟ ہر شخص اس سے کہے گا کہ میاں! ٹھیک ہے۔ پیسہ اچھی چیز ہے۔ اس کی قدر کرنی چاہئے۔ اسے سنبھال کر رکھنا چاہئے۔لیکن بچے کی جان کے مقابلے میں تو پیسہ کوئی چیز نہیں۔ انہی باتوں کے لئے تو پیسے کو سنبھال کر رکھا جاتا ہے۔ مال صدقۂ جان ہوتا ہے۔ جو شخص جان بچانے کے لئے مال خرچ نہیں کرتا وہ بدبخت بخیل ہے۔ وہ انسان نہیں۔ درندہ ہے۔ جان کے مقابلے میں مال کی حیثیت کیا ہے؟

آپ نے غور کیا کہ یہ بات کیا ہوئی؟ بات بالکل صاف ہے۔ مال و دولت بیشک اپنی قیمت رکھتے ہیں لیکن جان کی قیمت، مال سے کہیں زیادہ ہے۔ جو شخص کم قیمت کی چیز یعنی مال و دولت کو سنبھال کر رکھتا ہے اور اس سے کہیں زیادہ قیمتی چیز ___ یعنی جان ___ کو ضائع کر دیتا ہے، اُسے کوئی اچھا نہیں سمجھتا۔ جو شخص بڑی قیمت کی چیز کو بچانے کے لیے کم قیمت کی چیز کو قربان کر دیتا ہے، اس کی سب تعریف کرتے ہیں۔ یہی شخص عقلمند کہلاتا ہے۔

جہاں تک انسان کی اپنی جان بچانے کا تعلق ہے، بہت کم ایسے لوگ ہوں گے جو جان بچانے کی خاطر سب کچھ نہ کر گزریں۔ انسان تو ایک طرف، حیوانوں تک بھی اپنی جان بچانے کے لئے انتہائی کوشش کر دیتے ہیں۔ چیونٹی کو دیکھئے۔ کتنی ننھی سی جان ہے۔ لیکن اس کے سامنے انگلی رکھئے اور دیکھئے کہ وہ اس خطرے سے بچنے کے لئے کیا کچھ نہیں کرتی۔ جان بچانے کا جذبہ، ہر جاندار کے اندر قدرت کی طرف سے رکھا گیا ہے۔ کوئی ذی ہوش اپنی جان ضائع کرنے پر

آمادہ نہیں ہوتا۔ خودکشی وہی کرتا ہے جس کے ہوش وحواس ٹھکانے نہ رہیں۔ جس کی عقل پر جذبات غالب آکر اُسے اندھا کردیں۔ حیوانات کبھی خودکشی نہیں کرتے۔ غرضیکہ جان ایسی چیز ہے جسے بچانے کی خاطر انسان سب کچھ قربان کردیتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جان کی قیمت بہت زیادہ ہے ___ جان ہے تو جہان ہے ہمارے ہاں عام محاورہ ہے۔

لیکن، جان کی اتنی بڑی قیمت کے باوجود، ایسے وقت بھی آجاتے ہیں، کہ جو شخص اس وقت جان بچاتا ہے اُسے ہر شخص نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور جو شخص جان دے دیتا ہے، ہر شخص اس کی تعریف کرتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی درندہ انسان، کسی شریف زادی کی عصمت پر ہاتھ ڈالنا چاہے اور وہ غیرت مند خاتون اپنی عصمت بچانے کی کوشش میں اپنی جان دے دے، تو اس خاتون کی جرأت اور قربانی کا ہر جگہ چرچا ہوتا ہے۔ ہر شخص تعظیم سے اس کا نام لیتا ہے۔ ہم اپنے بچوں کو بڑے فخر سے اس کی کہانی سناتے ہیں۔ اسی کا نام غیرت ہے۔ اگر کسی باپ کے ساتھ اس کی جوان بیٹی جارہی ہو اور کوئی روسیاہ اس لڑکی کی طرف میلی نظر سے دیکھے تو غیرت مند باپ چیتے کی طرح جھپٹ کر اس کا گلا دبوچ لے گا اور اس کی قطعاً پروا نہیں کرے گا کہ ایسا کرنے میں اس کی جان جاتی ہے یا رہتی ہے۔ اگر بیٹی کی عصمت کی حفاظت میں وہ باپ اپنی جان دے دیتا ہے تو ساری دنیا اس کا نام تعظیم سے لیتی ہے۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ وہ اس اصول پر عمل کرتا ہے کہ ___ ''جان صدقۂ آبرو'' ___ آبرو کی حفاظت کے لئے جان دے دینا، شرفِ انسانیت کا تقاضا ہے۔

لیکن جہاں ہمیں ایسے باپ ملیں گے جو بیٹی کی طرف بُری نگاہ سے دیکھنے والے کا گلا دبوچ لیں گے وہاں ایسے بے غیرت انسان بھی ملیں گے جو چند روپوں کی خاطر اپنی بیٹیوں کو دوسروں کے ہاں لے جائیں گے۔ ایسے لوگوں کا شمار رذیل تریں انسانوں میں ہوتا ہے۔ انہیں بے غیرت اور دیوث کہا جاتا ہے۔ کوئی شریف آدمی انہیں اپنے پاس بٹھانے کا روادار نہیں ہوتا۔ ان کے پاس کتنی دولت کیوں نہ جمع ہوجائے اور غلط معاشرے میں وہ اس دولت کی بناء پر اپنے لئے کوئی اُونچی جگہ بھی کیوں نہ حاصل کرلیں۔ دنیا انہیں کبھی عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھے گی۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ انہوں نے آبرو جیسی بیش بہا متاع کو مال و دولت جیسی کم قیمت چیز کے

بدلے میں بیچ دیا۔ جو شخص کم قیمت کی چیز کی خاطر بڑی قیمت کی چیز کو قربان کر دیتا ہے۔ وہ انسانیت کے مقام سے گر جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو سپاہی میدانِ جنگ سے پیٹھ دکھا کر بھاگ جاتا ہے وہ دنیا میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتا۔ اس نے حق اور صداقت کی خاطر جان دینے کے بجائے، جان بچانے کو ترجیح دی۔ اس نے بہت بڑی قیمتی متاع کی حفاظت کے مقابلہ میں اُس سے کم قیمت کی چیز کو محفوظ رکھا۔ وہ دنیا کی نظروں میں ذلیل اور خوار ہو گیا۔ اس نے ''جان صدقۂ آبرو'' کے اصول پر عمل نہ کیا۔

لیکن ایک چیز قابل غور ہے۔ جہاں تک جان بچانے کا تعلق ہے، اس میں دنیا کے کسی انسان کو کسی قسم کا اختلاف نہیں۔ کوئی شخص پاکستان کا رہنے والا ہو یا انگلستان کا۔ افریقہ کا حبشی ہو یا امریکہ کا سفید فام، جنگل میں رہنے والا وحشی انسان ہو یا شہر کا مہذب باشندہ۔ ہر شخص اس سے متفق ہوگا کہ جان کا بچانا ضروری ہے لیکن جہاں تک آبرو کا تعلق ہے اس میں مختلف انسانوں میں ہی نہیں بلکہ مختلف قوموں میں بھی فرق ہے۔ ہمارے ہاں اگر کسی کنواری لڑکی سے لغزش ہو جائے اور اسے حمل قرار پا جائے تو اسے اس قدر معیوب سمجھا جاتا ہے کہ بسا اوقات وہ لڑکی شرم کے مارے اپنی جان ہلاک کر لیتی ہے۔ لیکن انگلستان میں اسے قطعاً بُرا نہیں سمجھا جاتا۔ حتیٰ کہ اگر اس بچے کا باپ اُس لڑکی سے شادی کر لے تو اُس بچے کو قانوناً جائز بیٹا تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ آبرو کے متعلق یہ اختلاف بڑا غور طلب ہے۔ انگلستان والے کہتے ہیں کہ چونکہ یہ چیز ہماری سوسائٹی میں بُری نہیں سمجھی جاتی اس لئے یہ بُری نہیں ہے۔ تمہاری سوسائٹی اسے بُرا سمجھتی ہے اس لئے تم اسے بُرا کہتے ہو۔ سوال یہ ہے کہ کیا کسی چیز کے اچھے یا بُرے ہونے کا معیار یہی ہے کہ جس چیز کو سوسائٹی اچھا قرار دے وہ اچھی ہو جاتی ہے اور جسے وہ بُرا کہہ دے وہ بُری ہوتی ہے؟ یہ معیار تو کوئی معیار نہیں۔ معیار ایسا ہونا چاہئے جس کے مطابق اچھی بات ہمیشہ اچھی سمجھی جائے اور بُری بات بُری ہی رہے خواہ ساری دنیا اسے اچھا کیوں نہ سمجھنے لگ جائے۔

ہمارے لئے یہ معیار ہے اللہ کی کتاب ــــ قرآن مجید ــــ وہی یہ بتاتا ہے کہ کون سی چیز زیادہ قیمتی ہے اور کون سی کم قیمت کی۔ کون سی چیز ایسی ہے جسے اس سے زیادہ قیمتی چیز کی خاطر

قربان کر دینا چاہئے اور کون سی ایسی جسے کسی حالت میں بھی قربان نہیں کیا جا سکتا۔ ایسی چیزیں جنہیں کسی دوسری چیز کی خاطر قربان نہیں کیا جا سکتا۔ مستقل اقدار کہلاتی ہیں۔ اقدار، قدر کی جمع ہے اور قدر کے معنی ہیں قیمت۔ لہٰذا، قرآن مجید ہمیں یہ بتاتا ہے کہ مستقل اقدار کیا ہیں۔ انہی کو نہ بدلنے والے اصول یا قوانینِ خداوندی کہا جاتا ہے۔

جو شخص قرآن مجید کی بتائی ہوئی اقدار کو صحیح مانتا ہے اُسے مسلمان کہتے ہیں اور جو مملکت ان اقدار کی حفاظت کرتی اور ان کے مطابق معاملات کے فیصلے کرتی ہے اسے اسلامی مملکت کہتے ہیں۔

آئندہ خطبات میں یہ بتایا جائے گا کہ یہ مستقل اقدار کیا ہیں۔

دوسرا خطبہ:

قانونِ مکافاتِ عمل

قال اللہ تعالیٰ: فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝

(99:7-8)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جو شخص ایک ذرّہ برابر بھی بھلائی کرتا ہے اسے اس کی جزاء ملتی ہے اور جو شخص ایک ذرّہ برابر بُرائی کرتا ہے اسے اس کی سزا ملتی ہے۔

پچھلے خطبہ میں یہ بتایا گیا تھا کہ دین ہمیں مستقل اقدار دیتا ہے۔ جو کام ان مستقل اقدار کے مطابق کیا جائے اسے نیکی کہتے ہیں۔ جو ان کے خلاف کیا جائے وہ بُرائی کہلاتی ہے۔ پیشتر اس کے کہ یہ بتایا جائے کہ وہ مستقل اقدار کیا ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے حضور نبی اکرم ﷺ پر نازل کردہ وحی کے ذریعے قرآن مجید میں عطا کیا ہے، ایک اور بات کا سمجھ لینا نہایت ضروری ہے۔

آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے ہاں ٹریفک کا قانون یہ ہے کہ سڑک کے بائیں ہاتھ چلو۔ آپ کسی ایسے چوراہے پر کھڑے ہو جائیں جہاں عام طور پر تانگے۔ سائیکل وغیرہ آتے جاتے ہوں۔ آپ دیکھیں گے کہ تانگے والا دور سے دیکھے گا کہ چوراہے پر ٹریفک کا سپاہی ہے یا

نہیں۔ اگر سپاہی کھڑا ہے تو وہ بائیں ہاتھ چل کر موڑ مڑے گا۔ لیکن اگر سپاہی نہیں ہے تو وہ جھٹ سے دائیں ہاتھ کی طرف ہو لے گا۔ اگر سپاہی کہیں چھپا کھڑا ہے تو وہ تانگے والے کو پکڑ لے گا اور اسے اس قانون شکنی کی سزا ملے گی۔ اگر سپاہی وہاں فی الواقعہ موجود نہیں تو تانگے والا دَن دناتا ہوا چلا جائے گا۔ کوئی اُسے پوچھے گا بھی نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تانگے والے نے غلط کام تو کیا ہے لیکن اسے اس کی سزا نہیں ملی۔

یا اگر وہاں سپاہی موجود ہے اور وہ دیانتدار نہیں تو تانگے والا اُسے دو چار آنے کے پیسے دے کر چھوٹ جائے گا۔ اس صورت میں بھی وہ اپنے جرم کی سزا سے بچ جائے گا۔ یا اگر سپاہی نے اس کا چالان کر دیا ہے لیکن (بدقسمتی سے) مجسٹریٹ دیانتدار نہیں تو بھی مجرم سزا سے بچ جاتا ہے۔ آپ غور کیجئے کہ کتنے لوگ ہیں جو قانون شکنی کے باوجود اس طرح سزا سے بچ جاتے ہیں اور دل میں خوش ہوتے اور فخر کرتے ہیں کہ ہم سب کچھ کرتے ہیں لیکن ہمارا کوئی بال بیکا نہیں کر سکتا۔

قانون شکنی اور اس کی سزا کی ایک صورت تو یہ ہے۔ اب دوسری صورت دیکھئے۔ ہمارے محلے میں ایک شخص بیمار تھا۔ ڈاکٹر نے اس کے مرض کی تشخیص کی۔ دوائی دی اور ساتھ ہی تاکید سے کہہ دیا کہ تم نے میٹھا نہیں کھانا۔ اگر ایسا کرو گے تو مرض بڑھ جائے گا۔ ڈاکٹر بڑا قابل تھا۔ علاج بھی نہایت عمدگی سے ہو رہا تھا۔ لیکن مریض کو فائدہ ہونے کے بجائے، دن بدن اس کی حالت خراب ہوتی جا رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب اس سے پوچھتے کہ تم میٹھا تو نہیں کھاتے۔ وہ پورے یقین کے ساتھ کہہ دیتا کہ بالکل نہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی سمجھ میں بات نہیں آتی تھی کہ آخر ماجرا کیا ہے۔ اسے آرام کیوں نہیں آتا۔ ایک دن جبکہ کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ مریض کی بیوی نے دیکھا کہ وہ چپکے سے میٹھا کھا رہا ہے۔ وہ جھٹ سے اوپر جا پہنچی اور اس سے کہا کہ آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟ اُس نے کہا کہ اس وقت کون سے ڈاکٹر صاحب دیکھ رہے تھے۔ میں تو ہر روز ایسا ہی کرتا ہوں۔

آپ نے غور کیا کہ تانگے والے نے بھی حکم کی خلاف ورزی کی اور اس بیمار نے بھی حکم کی خلاف ورزی کی۔ تانگے والے کو اگر کسی نے نہیں دیکھا تو اس کا کچھ نقصان نہیں ہوا۔ وہ حکم کی

خلاف ورزی کی سزا سے بچ گیا۔لیکن یہ مریض، ڈاکٹر کے حکم کی خلاف ورزی کی سزا سے نہیں بچ سکا۔ یہ اُس کے حکم کے خلاف میٹھا کھاتا رہا اور اس کی سزا یہ تھی کہ اس کی بیماری برابر بڑھتی رہی۔ اس سے اس پر کوئی فرق نہیں پڑا کہ اِسے کوئی شخص دیکھتا تھا یا نہیں دیکھتا تھا۔ ڈاکٹر وہاں موجود تھا یا نہیں تھا۔فرض کیجئے کہ اسے کوئی شخص میٹھا کھاتے دیکھ لیتا اور وہ اُسے دس روپے دے کر اس کی منت کرتا کہ یہ بات ڈاکٹر کو نہ بتانا۔اس صورت میں بھی وہ اپنے جرم کی سزا سے بچ نہیں سکتا تھا۔ میٹھا اپنا مضر اثر برابر کئے جاتا۔اس کی تکلیف بڑھتی چلی جاتی۔اس سے ظاہر ہے کسی کو اس قسم کے جرم کی سزا سے نہ رشوت بچا سکتی ہے نہ سفارش جو اس قسم کا جرم کرتا ہے اُسے اس کی سزا بھگتنی پڑتی ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت اُسے اس سزا سے بچا نہیں سکتی۔

ایک اور شخص کا واقعہ سنیے۔اس کی صحت بڑی اچھی تھی اور وہ فخر سے لوگوں سے کہا کرتا تھا کہ دیکھئے! سال بھر ہوا، ڈاکٹروں نے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ اگر تم نے میٹھا کھانا کم نہ کیا تو مر جاؤ گے۔ میں برابر میٹھا کھا رہا ہوں۔لیکن میرا کچھ بھی نہیں بگڑا۔ایک دن معلوم ہوا کہ وہ اچھا بھلا سویا۔آدھی رات کے وقت اُسے دورہ سا پڑا۔صبح ڈاکٹر کے ہاں لے گئے تو اس نے کہا کہ اس کے بچنے کی بہت کم اُمید ہے۔ یہ مسلسل میٹھا کھاتا رہا ہے۔اس نے اس کی حالت سخت خراب کر دی ہے۔آپ سمجھے کہ اس کا مطلب کیا ہے؟ مطلب یہ کہ اس شخص پر میٹھا اپنا اثر برابر کر رہا تھا۔لیکن اسے اس کا احساس نہیں ہوتا تھا۔وہ مضر اثر بڑھتا چلا گیا۔تا آنکہ ایک دن اس کی حالت اس قدر خراب ہوگئی کہ اس کی جان کے لالے پڑ گئے۔یعنی اُسے ڈاکٹر کے حکم کی خلاف ورزی کی سزا تو برابر مل رہی تھی لیکن وہ اسے محسوس نہیں کرتا تھا تا آنکہ ایک دن مرض نے اسے سختی سے پکڑ لیا۔اس سے معلوم ہوا کہ بعض جرائم ایسے ہیں کہ ان کی سزا کا اثر بہت دیر میں جا کر نمودار ہوتا ہے۔مجرم سمجھتے ہیں کہ ہمارا کچھ نہیں بگڑ رہا لیکن یہ ان کی بھول ہوتی ہے۔اندر ہی اندر ان کا سب کچھ بگڑ رہا ہوتا ہے۔

اب ایک اور مثال سنیے۔ایک شخص محنت مزدوری کر کے کچھ کماتا ہے اور اپنی حلال کی کمائی سے گھی خرید کر لاتا ہے۔گھی کھانے سے اس کی طاقت بڑھتی ہے۔دوسرا شخص کسی کی جیب کاٹتا ہے اور پولیس کی گرفت سے بچ جاتا ہے۔وہ جو روپیہ اس طرح حاصل کرتا ہے اس کا گھی خرید کر لاتا ہے۔

گھی کھانے سے اس کی بھی طاقت ویسے ہی بڑھتی ہے جیسے پہلے شخص کی۔ یعنی جہاں تک انسان کے جسم کی صحت اور طاقت کا تعلق ہے، گھی یکساں اثر کرتا ہے خواہ وہ حلال کی کمائی سے خریدا جائے یا حرام کی کمائی سے۔ اس سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص (جس نے چوری کے روپے سے گھی خریدا تھا) اپنے جرم کی سزا سے بالکل بچ گیا۔ یہ پولیس کی گرفت سے بچ نکلا اس لئے اسے عدالت سے سزا نہ ملی اور خالص گھی کھاتا رہا اس لئے (میٹھا کھانے والے مریض کی طرح) اس کی صحت پر بھی بُرا اثر نہ پڑا۔ اس سے لوگ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ اگر انسان ایسا انتظام کر لے کہ وہ پولیس کی گرفت میں نہ آ سکے۔ یا اسے عدالت سزا نہ دے۔ تو پھر اس کے جرم کی سزا کہیں سے نہیں ملتی۔

قرآنِ کریم کہتا ہے کہ یہ غلط ہے۔ چوری کے پیسوں کا گھی کھانے سے انسان کے جسم پر کوئی بُرا اثر نہیں پڑتا۔ لیکن انسان کے جسم کے علاوہ ایک اور چیز بھی ہے جسے اس کی ذات کہتے ہیں۔ حلال کی کمائی سے انسان کی ذات میں طاقت آتی ہے۔ حرام کی کمائی سے جو کچھ کھایا جائے اس سے اس کی ذات بیمار ہو جاتی ہے۔ اس چیز سے انسان کو کوئی نہیں بچا سکتا۔ وہ پولیس کی گرفت سے بچ جائے۔ وہ عدالت کو رشوت دے کر یا سفارش پہنچا کر یا کسی اور طریق سے اپنا اثر ڈال کر، بری ہو جائے۔ لیکن اسے اس کے جرم کی سزا مل کر رہتی ہے۔ یہ سزا اس کے جسم کو نہیں بلکہ اس کی ذات کو ملتی ہے۔ اس سے اُسے کوئی نہیں بچا سکتا۔

سوال یہ ہے کہ یہ سزا کون دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہم نے ایسا قانون مقرر کر رکھا ہے کہ جو لوگ مستقل اقدار کے مطابق زندگی بسر کریں، انہیں اس کا عمدہ اور خوشگوار بدلہ ملے اور جو لوگ ان اقدار کی خلاف ورزی کریں، انہیں اس کی سزا ملے۔ خدا کا یہ قانون اس قدر محکم اور مضبوط ہے کہ اس کی زد سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ ﴿۱۲﴾ (85:12) ''یہ حقیقت ہے کہ تیرے رب کی گرفت بڑی سخت ہوتی ہے۔'' اس قانون کو جس کے مطابق انسان کے ہر ایک کام کی جزاء یا سزا مل کر رہتی ہے، قانونِ مکافاتِ عمل کہتے ہیں۔ یعنی انسانی اعمال کے بدلہ ملنے کا قانون۔ آپ پولیس والے کی نگاہ سے بچ سکتے ہیں لیکن خدا کے اس قانون کی نگاہ سے نہیں بچ سکتے۔ وہ خدا جس کی کیفیت یہ ہے کہ يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي

الصُّدُوۡرُ ﴿۱۹﴾ (40:19) ''جو نگاہوں کی خیانت اور دل میں چھپائے ہوئے ارادوں تک سے واقف ہے۔'' یعنی اس کا قانونِ مکافات صرف اُسی وقت گرفت نہیں کرتا جب کوئی شخص جرم کا مرتکب ہو جائے۔ وہ اُس وقت گرفت کرتا ہے جب جرم کا خیال اس کے دل میں پیدا ہو۔ اس کا ارشاد ہے کہ وَنَعۡلَمُ مَا تُوَسۡوِسُ بِهٖ نَفۡسُهٗ ۖۚ وَنَحۡنُ اَقۡرَبُ اِلَيۡهِ مِنۡ حَبۡلِ الۡوَرِيۡدِ ﴿۱۶﴾ (50:16) ''انسان کا دل جو وسوسے اس کے اندر پیدا کرتا ہے ہم انہیں بھی جانتے ہیں۔ (جانیں کیوں نہ؟) ہم اس کی رگِ جان سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔'' ہم نے اپنے قانونِ مکافاتِ عمل کی میزان کھڑی کر رکھی ہے جس میں ہر شخص کے اعمال (بلکہ اس کے خیالات اور ارادے) تُلتے رہتے ہیں۔ فَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ خَيۡرًا يَّرَهٗ ؕ﴿۷﴾ (99:7) ''سو جو شخص ذرّہ بھر بھی بھلائی کرتا ہے وہ بھی اس کے سامنے آجاتی ہے'' وَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ﴿۸﴾ (99:8) ''اور جو شخص ذرّہ برابر بھی بُرائی کرتا ہے وہ بھی اس کے سامنے آجاتی ہے۔ ان جرائم کی سزا سے کوئی شخص کسی صورت میں بھی بچ نہیں سکتا۔ لَّا تَجۡزِىۡ نَفۡسٌ عَنۡ نَّفۡسٍ شَيۡـــًٔا (2:48)۔ اس بارے میں کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے کام نہیں آسکتا۔ وَلَا يُقۡبَلُ مِنۡهَا شَفَاعَةٌ (2:48) نہ ہی اس سے کوئی سفارش قبول کی جاسکتی ہے۔ وَّلَا يُؤۡخَذُ مِنۡهَا عَدۡلٌ (2:48) نہ ہی کوئی شخص کچھ معاوضہ دے کر چھوٹ سکتا ہے۔ وَّلَا هُمۡ يُنۡصَرُوۡنَ ﴿۴۸﴾ (2:48) اور نہ ہی ایسے لوگوں کو کسی قسم کی مدد دی جاسکتی ہے۔ یہ ہے خدا کا قانونِ مکافات۔

مسلمان وہ ہے جو خدا کے اس قانونِ مکافاتِ عمل پر پورا پورا یقین رکھے۔ اسی کو ایمان کہتے ہیں۔ یاد رکھیئے! جو شخص قانون شکنی کرتے وقت یہ سمجھتا ہے کہ مجھے کون دیکھتا ہے۔ یا جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ میں رشوت دے کر۔ سفارش پہنچا کر یا اپنا اثر ڈال کر جُرم کی سزا سے بچ جاؤں گا وہ خدا کے قانونِ مکافات پر ایمان نہیں رکھتا۔

چونکہ اسلامی مملکت، قوانینِ خداوندی کو دُنیا میں نافذ کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے اس لئے اس مملکت میں کوئی مجرم اپنے جرم کی سزا سے نہیں بچ سکتا۔ اس میں نہ رشوت کام دے سکتی ہے نہ

سفارش۔ نہ کسی کا اثر ورسوخ کچھ کرسکتا نہ اس کا عہدہ یا مرتبہ اس کے کسی کام آسکتا ہے۔ اس میں جو شخص قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے وہ اپنے کئے کی سزا پاتا ہے۔ جو قانون کا احترام کرتا ہے وہ عزت اور امن کا مستحق ہوتا ہے۔ یہ غیر متبدل اصول ہے۔ یہ مستقل قدر ہے جسے کوئی نہیں بدل سکتا۔ والسلام

تیسرا خطبہ:

دیر ہے، اندھیر نہیں

قال اللہ تعالیٰ: اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ﴿۲۱﴾ ۔۔۔۔

(6:21)

ارشادِ خداوندی ہے کہ اس بات پر اچھی طرح سے یقین رکھو کہ ظالم کی کھیتی کبھی پروان نہیں چڑھ سکتی۔ ظلم کرنے والے کبھی کامیاب نہیں ہوسکتے۔

گزشتہ خطبہ میں ہم نے بتایا تھا کہ خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق انسان کا ہر کام نتیجہ مرتب کر کے رہتا ہے۔ جو بھلائی کرتا ہے اسے اس کی جزاء ملتی ہے۔ جو برائی کرتا ہے وہ اس کی سزا پاتا ہے۔ خدا کے اس قانون میں کبھی کوتاہی نہیں ہوتی۔ اس میں کوئی شخص کمی بیشی نہیں کرسکتا۔ وہ خطبہ سننے کے بعد ایک شخص میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ جو کچھ آپ نے کہا تھا اس پر ہمارا ایمان تو ہے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔ لیکن معاف فرمائیے۔ ہم جو کچھ دنیا میں اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں وہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ خدا کا فرمان تو یہ ہے کہ ظالم کی کھیتی کبھی پروان نہیں چڑھتی۔ ظلم کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔ بددیانتی اور بے ایمانی ہمیشہ نقصان دیتی ہے جو دوسرے کا بُرا کرتا ہے اس کا ہمیشہ بُرا ہوتا ہے۔ جو مظلوم کو ستاتا ہے وہ کبھی چین سے نہیں بیٹھ سکتا۔ جو غریبوں کو لوٹتا ہے وہ تباہ اور برباد ہوجاتا ہے۔ جو کمزوروں پر ہاتھ اٹھاتا ہے اس کے ہاتھ ٹوٹ جاتے ہیں۔ جو کسی کے لئے کنواں کھودتا ہے وہ خود کنوئیں میں گرتا ہے۔ لیکن ہم دیکھتے یہ ہیں کہ دُنیا میں ہوتا اس کے بالکل اُلٹ ہے۔ دور کیوں جائیں۔ ہم نے خود پاکستان میں جو کچھ ہوتے دیکھا ہے وہ اس کی زندہ شہادت ہے کہ ظالم کی کھیتی پروان چڑھتی ہے اور مظلوم ہمیشہ تباہ اور برباد ہوتا ہے۔ دولت مند لوگ اپنی دولت کے نشے میں بدمست سب کچھ کرتے

ہیں اور انہیں کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا۔ وہ غریبوں پر ہر قسم کا ظلم ڈھاتے ہیں۔ وہ ان کی محنت کی کمائی اُن سے زبردستی چھین لیتے ہیں۔ اُن کے ہاتھوں نہ ان غریبوں کی جان محفوظ ہوتی ہے نہ مال۔ نہ عزت بچ کر رہتی ہے نہ آبرو۔ وہ در بدر دھکے کھاتے ہیں۔ ایک ایک کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں۔ وہ ہر صاحبِ اقتدار سے عدل وانصاف کی بھیک مانگتے ہیں۔ لیکن ان کی جھولی میں کہیں سے ایک ٹکڑا نہیں پڑتا۔ ان ظالموں، خونخواروں کے گُتے ریشمی گدوں پر سوتے ہیں اور بیچاری بیواؤں کے یتیم بچوں کو سردی سے بچنے کے لئے لحاف تک نصیب نہیں ہوتا۔ معاف فرمایئے! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ خدا کا قانونِ مکافات کہاں چلا جاتا ہے؟ ہمیں بتایا یہ جاتا ہے کہ دیانتداری سے کاروبار میں برکت ہوتی ہے۔ لیکن ہم نے دیکھا یہ ہے کہ کاروبار چلتا ہی اس کا ہے جو بددیانتی کرے۔ ایمانداری سے کام کرنے والا چار دن میں اپنی پونجی بھی ضائع کر کے بیٹھ جاتا ہے لیکن بددیانتی کرنے والے سونے کے محلات بناتے چلے جاتے ہیں۔ معلوم نہیں خدا کا قانونِ مکافات کون سی دنیا میں چلتا ہے۔ ہماری دنیا میں تو یہی قانون ہے کہ جس کی لاٹھی اُس کی بھینس۔ ہمارے ہاں تو مسلسل یہی قانون چلتا آرہا ہے۔

جس شخص نے ہم سے یہ باتیں کیں وہ بڑا دکھی تھا۔ ہم نے بڑے اطمینان اور سکون سے ان باتوں کو سُنا۔ یہ باتیں تنہا اُس ایک شخص کے دل کی آواز نہیں تھی۔ ہزاروں، لاکھوں مظلوم انسان ہیں جن کے دل میں اسی قسم کے خیالات آتے ہیں۔ ان میں سے بعض لوگ ان خیالات کو زبان تک لے آتے ہیں۔ باقی اپنے دل کے اندر رکھتے ہیں۔ یہ خیالات ایسے نہیں جنہیں یونہی سُن کر ٹال دیا جائے۔ ان پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے اور ٹھنڈے دل سے سوچنا چاہئے کہ اگر خدا کا قانونِ مکافات برحق ہے (اور اس کے برحق ہونے میں کسے شبہ ہوسکتا ہے؟) تو پھر دنیا میں ایسا کیوں ہوتا ہے؟

بات بڑی اہم ہے اس لئے اسے بڑی توجہ سے سُننا چاہئے۔ اسے ایک مثال سے سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ اکتوبر، نومبر کا مہینہ ہے۔ زمینیں گیہوں کی بوائی کے لئے تیار ہیں۔ اُن دنوں کسانوں کے گھروں میں عام طور پر غلے کی کمی ہوتی ہے لیکن انہوں نے بیج کے لئے غلہ سنبھال

کر رکھا ہوتا ہے۔ دو کسان ہیں جن کے گھروں میں فاقوں تک کی نوبت آ رہی ہے۔ ان میں سے ایک کسان اپنے بیج کا غلہ لیتا ہے اور چکی پر جا کر آٹا پسوالاتا ہے۔ اس کے گھر میں رات کو تازہ تازہ گیہوں کی روٹیاں پکنے لگ جاتی ہیں۔ وہ اور اس کے بیوی بچے پیٹ بھر کر روٹی کھاتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں کہ ان کی مصیبت کٹ گئی۔ دوسرا کسان غلہ باہر لے جاتا ہے اور کھیت میں بیج ڈال دیتا ہے۔ اس کے گھر میں بدستور تنگی رہتی ہے۔ اسے اور اس کے بیوی بچوں کو گیہوں کی روٹی دیکھنی تک نصیب نہیں ہوتی۔ یہ ہر روز کھیت پر جاتا ہے اور دن بھر محنت کرتا ہے۔ لیکن شام کو پھر خالی ہاتھ واپس گھر آ جاتا ہے۔ دوسرا کسان اپنا بیل بیچ کر چند دن کے لئے پھر مزے اڑاتا ہے۔ پھر زمین رہن رکھ دیتا ہے اور بڑی خوشحالی سے دن گزارتا ہے۔ لیکن اس کا ہمسایہ سخت مصیبت کے دن کاٹتا ہے۔ ایک مہینہ، دو مہینے، تین مہینے، چار مہینے، پانچ مہینے، چھ مہینے صبح سے شام اور شام سے صبح، برابر محنت کرتا ہے لیکن اسے کھیت میں سے ایک وقت کی روٹی بھی نہیں ملتی۔ اس کے بچے اس سے برابر پوچھتے رہتے ہیں کہ بابا! ہمارا ہمسایہ کوئی کام نہیں کرتا اور وہ اس کے بچے عیش اڑاتے ہیں، ہم دن رات محنت کرتے رہتے ہیں اور ہمیں ٹکڑا تک نصیب نہیں ہوتا۔ ہم نے سُنا تھا کہ محنت اپنا پھل لاتی ہے لیکن ہماری محنت تو کوئی پھل نہیں لاتی۔ ہم تو محنت کرتے ہیں اور خالی ہاتھ گھر آ جاتے ہیں وہ ان سے کہتا ہے کہ بیٹا! محنت اپنا پھل لاتی ہے۔ خدا کا قانون بالکل سچا ہے۔ لیکن بیج بونے اور فصل پکنے میں ایک وقفہ ہوتا ہے۔ ایک مدت ہوتی ہے کوئی شخص اس وقفے کو کم نہیں کر سکتا۔ جو شخص ہمت اور استقلال سے اس دوران میں محنت کئے جاتا ہے اور حوصلہ نہیں ہارتا، اس کی محنت اپنے وقت پر پھل لا کر رہتی ہے۔ وہ انہیں یہ نصیحتیں کرتا رہتا ہے کہ اتنے میں کٹائی کے دن آ جاتے ہیں اور اس کسان کا سارا گھر غلے سے بھر جاتا ہے۔ اس کی محنت بالآخر پھل لاتی ہے: كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ (2:261) ''اس دانے کی طرح جو سات بالیں اگائے اور ہر ایک بال میں سو سو دانے ہوں۔'' اس طرح اس دیانتدار محنت کش کسان کو ایک ایک دانے کے بدلے سات سات سو دانے ملتے ہیں۔ اس کے برعکس دوسرا کسان جس نے خدا کے قانون کو چھوڑ کر، بیج کے دانے

پسوا لئے تھے، اس کا نہ گھر رہا نہ بار، نہ ڈھور ہے نہ ڈنگر۔ نہ کھیتی رہی نہ زمین۔ وہ مفلس اور قلاش ہو کر در بدر کی بھیک مانگنے لگ گیا۔

یہ کیفیت ہے خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی۔ وہ بالکل برحق ہے۔ لیکن بیج کے بونے اور کھیتی کے پکنے میں وقت ضرور لگتا ہے۔ جو اس سے تنگ نہیں آتا اور ہمت اور استقلال سے تمام مشقتوں کو برداشت کرتا ہے اس کی کھیتی پروان چڑھ جاتی ہے۔ جو مایوس ہو کر، زمین میں بیج نہیں ڈالتا۔ یا جلد بازی میں سبز گیہوں بیلوں کو چرا دیتا ہے، وہ آخر الامر تباہ اور برباد ہو جاتا ہے۔ یہی مثال ظالم کی ہے۔ اس کی کھیتی کبھی نہیں پنپتی۔ لیکن اس کے ظلم کرنے اور ظلم کا نتیجہ برآمد ہونے میں ایک وقفہ ہوتا ہے۔ اگر وہ اس مہلت کے وقفے میں سمجھ جائے۔ اُسے ہوش آجائے اور وہ ظلم کو چھوڑ کر مظلوموں کی امداد کرنے لگ جائے۔ وہ غریبوں سے ہمدردی کرے۔ وہ عدل اور انصاف کے راستے ہموار کر دے۔ وہ دیانت اور امانت پر کاربند ہو جائے۔ تو اس کے یہ نیک کام اس کی سابقہ برائیوں کے داغوں کو دھو ڈالتے ہیں۔ لیکن اگر وہ ایسا نہ کرے اور اپنے ظلم اور سرکشی میں بڑھتا ہی چلا جائے تو پھر خدا کا قانون ایسے لوگوں سے پکار کر کہتا ہے کہ اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ ﴿۴۰﴾ عَلٰٓی اَنْ نُّبَدِّلَ خَیْرًا مِّنْهُمْ ۙ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِیْنَ ﴿۴۱﴾ (70:40-41) ''ہم اس پر قادر ہیں کہ ان کی جگہ ایسے لوگوں کو لے آئیں جو ان سے بہتر ہوں۔ دنیا میں کوئی قوت ایسی نہیں جو ہمیں ایسا کرنے سے روک دے۔ جو ہمیں عاجز کر دے۔ جو ہم سے آگے بڑھ جائے۔ چنانچہ وہ لوگ، جو ان سے بہتر ہوتے ہیں آتے ہیں اور ان کے ظلم اور سرکشی کے راستوں کو روک کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور ان کی کلائیاں توڑ دیتے ہیں۔ یوں خدا کا قانونِ مکافاتِ عذاب بن کر ان کے سر پر مسلط ہو جاتا ہے۔ سورہ انبیاء میں قرآن کریم نے ان کی اس کیفیت کو بڑے دلکش اور عبرت انگیز انداز میں بیان کیا ہے۔ جہاں کہا ہے کہ وَ کَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْیَةٍ کَانَتْ ظَالِمَةً وَّ اَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِیْنَ ﴿۱۱﴾ (21:11) ''کتنی ہی بستیاں ہم نے تباہ اور برباد کر دیں جن کے رہنے والے ظالم تھے۔ اور ان کے بعد ہم نے (ان کی جگہ) دوسرے لوگوں کو اٹھا کھڑا کیا۔'' فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا یَرْكُضُوْنَ ﴿۱۲﴾

(21:12)۔ان ظالموں کی حالت یہ تھی، (وہ اپنی سرکشیوں میں مست تھے اور انہیں اس کا کچھ علم نہیں تھا کہ ان کے اعمال کے نتائج برآمد ہونے کا وقت آپہنچا ہے۔ چنانچہ) جب انہوں نے ہمارے عذاب کو محسوس شکل میں اپنے سامنے دیکھا تو اس سے بھاگنے لگے۔ ہمارے قانونِ مکافات نے پکارا کہ: لَا تَرْكُضُوْا (21:13) اب مت بھاگو۔ (تم بھاگ کر کہیں نہیں جاسکتے)۔وَارْجِعُوْٓا اِلٰى مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ وَمَسٰكِنِكُمْ (21:13) وہ بڑے بڑے محلات (جو تم نے غریبوں پر ظلم کر کے تعمیر کئے تھے) وہ تمہاری آسائش گاہیں (جن میں تم نے عیش وعشرت کے سامان جمع کر رکھے تھے) تم ان کی طرف واپس چلو۔ لَعَلَّكُمْ تُسْـَٔلُوْنَ۝۱۳ (21:13) تاکہ تم سے پوچھا جائے (کہ تم نے یہ دولت کہاں سے لی تھی)۔ انہیں اس طرح پکڑا جائے گا۔قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ۝۱۴ (21:14) اور وہ اس کا اقرار کریں گے کہ ہم نے واقعی لوگوں پر ظلم اور زیادتی سے یہ سب کچھ اکٹھا کیا تھا۔ فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ۝۱۵ (21:15) وہ ایسا پکارتے رہیں گے۔ (لیکن اس وقت ان کا یہ اعتراف اور اقرار انہیں کچھ فائدہ نہیں دے گا)۔ ہمارا قانونِ مکافات انہیں ایسا بنادے گا جیسے کٹے ہوئے کھیت۔ یا بجھے ہوئے شعلے (کہ جن کی صرف راکھ باقی رہ جائے)۔ یوں خدا کا قانونِ مکافات، ظالموں اور سرکشوں کو آخرالامر تباہ، اور برباد کر دیتا ہے۔

لیکن جن لوگوں کے ہاتھوں وہ انہیں تباہ اور برباد کراتا ہے ان سے واضح الفاظ میں کہہ دیتا ہے کہ تم یہ نہ سمجھ لینا کہ تم جو جی میں آئے کرو۔ تمہارا کچھ نہیں بگڑے گا۔ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ۝۱۴ (10:14) پھر ہم نے ملک میں تمہیں ان کا جانشین بنایا تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کس قسم کے کام کرتے ہو۔ انہوں نے ظلم کیا تو وہ تباہ اور برباد ہو گئے۔ تم ظلم کرو گے تو تم بھی تباہ اور برباد ہو جاؤ گے۔ خدا کا قانونِ مکافات نہ کسی پر ظلم کرتا ہے۔ نہ کسی کی رعایت کرتا ہے۔ مسلمان وہ ہے جو اس حقیقت پر یقین رکھے کہ عمل اور اس کے نتیجے میں وقفہ ضرور ہوتا ہے لیکن ایسا نہیں ہوسکتا کہ عملِ بد اپنا نتیجہ مرتب نہ کرے۔ ظلم کی کھیتی

جھلس کر رہتی ہے خواہ اس میں کتنی دیر کیوں نہ لگے۔ والسلام

چوتھا خطبہ:

افراد اور اُمت

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (3:109)

ترجمہ: تم بہترین قوم ہو جسے تمام نوع انسانی کی بھلائی کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔

سابقہ خطبہ میں یہ حقیقت آپ کے سامنے آ چکی تھی کہ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کے مطابق ہر کام ـــــ خواہ وہ دل میں گزرنے والا ارادہ ہی کیوں نہ ہو ـــــ اپنا نتیجہ پیدا کر کے رہتا ہے۔ اس میں وقت تو ضرور لگتا ہے، جس طرح ایک بیج کو فصل بننے کے لئے وقت لگتا ہے۔ لیکن یہ کبھی نہیں ہوتا کہ بیج بو یا جائے اور اس سے درخت بن کر پھل پیدا نہ ہو۔ یا بیج تو ہو کیکر کا لیکن اُس پیڑ میں آم لگ جائیں۔

لیکن یہ دیکھنے کی بات ہے کہ بیج، درخت کس طرح بنتا ہے ـــــ بیج کو مٹی میں ملایا جاتا ہے۔ پھر اس میں پانی دیا جاتا ہے۔ اوپر سے سورج کی گرمی پہنچتی ہے۔ اس سے اُس بیج میں سے کونپل نکلتی ہے۔ وہ ہوا سے غذا حاصل کرتی ہے اور آگے بڑھنا شروع ہو جاتی ہے۔ لہٰذا، بیج کے درخت بننے کے لئے اس کے ساتھ مٹی، پانی، حرارت، روشنی، ہوا کا ہونا ضروری ہے۔

لیکن اگر ایسا کریں کہ اعلیٰ قسم کا بیج لیں اور اُسے برآمدے کے ایک کونے میں رکھ دیں۔ اس کے پاس ہی ایک طرف صاف ستھری مٹی کا ڈھیر لگا دیں۔ ایک طرف پانی کی بالٹی بھر کر رکھ دیں۔ سورج کی دھوپ سے روشنی اور حرارت اس بیج کو خود بخود ملتی جائے گی۔ ہوا بھی برآمدے میں موجود ہے۔ اس طرح وہ تمام چیزیں جمع ہو جائیں گی جن سے درخت بنتا ہے۔ لیکن آپ سوچئے کہ اگر یہ چیزیں سو برس تک بھی اس طرح پڑی رہیں تو ان سے درخت تو ایک طرف، ایک پتی بھی بن سکے گی؟ کبھی نہیں۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ جب تک یہ تمام چیزیں ایک دوسرے کے ساتھ نہ ملیں، بیج میں سے کونپل کبھی نہیں پھوٹ سکتی۔ بیج سے درخت بننے اور درخت میں پھل آنے کے لئے ضروری ہے کہ یہ سب چیزیں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں اور

تعاون بھی اس قسم کا کہ یہ سب اپنی اپنی الگ ہستی کو ایک دوسرے کے اندر جذب کر کے ایک نئی شکل اختیار کر لیں۔ آم، کہ جس کی رنگت خوشبو اور ذائقہ اس قدر دلفریب اور روح افزا ہوتا ہے، مٹی، پانی، حرارت، روشنی اور ہوا ہی کے مجموعہ کا نام ہوتا ہے۔ وہ انہی اجزاء سے بنتا ہے۔ لیکن آپ دیکھئے کہ نہ تو اس کے اندر کہیں یہ چیزیں اپنی اپنی شکل میں الگ الگ موجود ہوتی ہیں اور نہ ہی ان میں سے کسی شے میں آم کی رنگت، خوشبو اور شیرینی ہوتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ فطرت کا قانون یہ ہے کہ جب تک مختلف چیزیں باہمی تعاون نہ کریں اور ایک دوسرے کے اندر جذب نہ ہو جائیں۔ کوئی نئی چیز پیدا نہیں ہوتی۔ اور جب یہ ایک دوسرے کے اندر جذب ہو جائیں تو اس طرح جو نئی چیز بنتی ہے وہ ان تمام چیزوں سے نہایت ارفع اور اعلیٰ ہوتی ہے جن سے مل کر یہ نئی چیز بنتی ہے۔ آپ غور کیجئے کہ اس مٹی اور پانی کی قیمت اور حیثیت کیا تھی جن کے مل جانے سے آم بنا ہے۔ لیکن آم بن کر ان کی قیمت اور حیثیت کیا سے کیا ہو گئی۔

جس طرح پانی، مٹی، ہوا، حرارت کے الگ الگ رہنے سے کوئی نتیجہ مرتب نہیں ہوتا اسی طرح اگر کسی جگہ کے انسان بھی الگ الگ رہیں تو ان سے کوئی فائدہ بخش کام سرانجام نہیں پاتا۔ لیکن جب یہی افراد ایک دوسرے کے ساتھ مل جائیں تو یہ دُنیا میں ایسے ایسے کام کرتے ہیں جنہیں دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ جب افراد آپس میں مل جائیں تو ان سے قوم بن جاتی ہے۔ قرآن کریم میں اس کے لئے اُمت کا لفظ آیا ہے۔

ہم نے دیکھا ہے کہ جب بیج، مٹی، پانی وغیرہ الگ الگ رہیں، خواہ وہ ایک ہی برآمدے کے اندر کیوں نہ ہوں، ان سے پودا نہیں بنتا۔ پودا بننے کے لئے شرط یہ ہے کہ یہ چیزیں ایک دوسرے سے تعاون کریں بلکہ ایک دوسرے کے اندر جذب ہو جائیں۔ عربی زبان میں اس طرح گھل مل جانے کو اُلفت کہتے ہیں۔ اس طرح، اگر کسی ملک کے افراد ایک دوسرے سے الگ الگ رہیں اور ہر ایک اپنے اپنے فائدے کے پیچھے لگا رہے، تو انہیں قوم یا اُمت نہیں کہا جا سکتا۔ یہ اُس وقت اُمت بنتے ہیں جب یہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں اور گھل مل کر رہیں۔ یعنی ان میں اُلفت پیدا ہو جائے۔ چنانچہ قرآن مجید میں مسلمانوں کے متعلق ہے

کہ: وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ۚ (3:103)۔ ''تم اللہ کے اس انعام کو یاد کرو کہ (ایک وقت وہ تھا) جب تم الگ الگ تھے اور ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ پھر اس نے تمہارے دلوں میں اُلفت ڈال دی۔ اور تم ایک دوسرے کے ساتھ گھل مل کر رہنے لگے۔ اس طرح تم اس کی نعمت سے بھائی بھائی بن گئے۔ وَ كُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ؕ (3:103) تم تباہی اور بربادی کے جہنم کے کنارے تک پہنچ چکے تھے کہ اللہ نے تمہیں اس میں گرنے سے بچالیا۔ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ (3:103) اس طرح اللہ اپنے قوانین کو تمہارے فائدے کے لئے کھول کھول کر بیان کرتا ہے تا کہ زندگی اور کامیابی کا سیدھا راستہ تمہارے سامنے آجائے۔ دوسری جگہ ہے: وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا (2:143) ''اور اس طرح ہم نے تمہیں ایک بہترین اُمّت (قوم) بنا دیا۔'' اس سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ قرآن مجید کی رُو سے افراد اس وقت قوم بنتے ہیں جب ان کے دل ایک دوسرے میں گھل مل جائیں۔ جب ان کے مفاد ایک دوسرے کے مفاد میں جذب ہو جائیں۔ اگر ایسی صورت پیدا نہ ہو تو محض ایک مقام پر اکٹھے رہنے سے اُمّت نہیں بن سکتی۔ قرآنِ کریم نے ایسے لوگوں کے لئے کہا ہے کہ: تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّقُلُوْبُهُمْ شَتّٰى (14:59) تو سمجھتا ہے کہ وہ اکٹھے ہیں حالانکہ ان کے دل ایک دوسرے سے الگ ہیں۔'' بَاْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيْدٌ (14:59) اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کی آپس میں سخت لڑائی ہوتی رہتی ہے۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ (14:59) یہ اس لئے کہ یہ لوگ عقل وفکر سے کام نہیں لیتے۔

آپ نے غور کیا کہ قرآن مجید نے افراد کے قوم بننے کے لئے کیا کیا شرائط عائد کی ہیں۔ یہ کہ ان کے دل ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوں۔ ان کے مفاد ایک دوسرے کے مفاد میں جذب ہوں۔ ان کا آپس میں کسی قسم کا لڑائی جھگڑا نہ ہو۔ اور وہ جذبات سے مغلوب ہو کر یونہی آپے سے باہر نہ ہو جایا کریں بلکہ ہر معاملہ پر ٹھنڈے دل سے غور وفکر کیا کریں۔ اس طرح جب مختلف افراد ایک قوم بن جاتے ہیں تو تمام افراد کی عزت اور پوزیشن ایک جیسی ہو جاتی ہے۔ آپ نے

دیکھا ہوگا کہ پھولوں کے پودوں میں کھاد ڈالی جاتی ہے۔ کھاد ایسی چیز ہے جس سے ہر شخص نفرت کرتا ہے۔ اس سے پرے پرے رہنا چاہتا ہے۔ لیکن وہی کھاد جب اپنے آپ کو مٹی اور پانی میں جذب کر دیتی ہے تو پھول بن جاتی ہے جسے ہر شخص سینے سے لگائے اور سر پر چڑھائے رکھتا ہے۔ کھاد کو اس قدر حسین، خوشبودار، صاحبِ عزت کس چیز نے بنا دیا؟ اس چیز نے کہ اس نے الگ رہنے کے بجائے اپنے آپ کو دوسرے اجزاء کے اندر جذب کر دیا۔ اسی طرف اُمت کے اندر جذب ہوجانے سے ہر فرد کی قدر و قیمت بڑھ جاتی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ مٹھائی چار روپے سیر بکتی ہے۔ مٹھائی میں کیا کیا ہوتا ہے؟ میدہ جس کی قیمت بارہ آنے سیر ہے۔ شکر (یعنی کھانڈ) جس کا نرخ ایک روپیہ فی سیر ہے۔ اگر میدہ الگ رہے اور شکر الگ رہے تو ان کی قیمت بارہ آنے اور ایک روپیہ فی سیر سے ایک پیسہ بھی زیادہ نہ ہو۔ لیکن جب انہوں نے اپنے آپ کو دیگر اجزاء کے ساتھ ملا دیا تو ان کی قیمت بھی چار روپے فی سیر ہوگئی۔[1] اسی طرح جب افراد، اپنے آپ کو اُمت میں جذب کر دیتے ہیں تو سب افراد کی قیمت ایک جیسی ہوجاتی ہے۔ اس میں بڑے اور چھوٹے کا کوئی فرق نہیں رہتا۔ جو قیمت قوم کے سب سے بڑے فرد کی ہوتی ہے وہی قیمت قوم کے سب سے چھوٹے فرد کی ہوتی ہے ان میں تقسیم کار کا فرق ضرور ہوتا ہے۔ کسی کے ذمّے کوئی کام اور کسی کے ذمّے کوئی۔ لیکن تقسیمِ کار سے افراد کی عزت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ عزت سب کی برابر ہوتی ہے۔ آپ گھڑی کو دیکھئے۔ اس میں مختلف پرزے ہوتے ہیں اور ہر ایک پرزے کے ذمّے الگ الگ کام ہوتے ہیں۔ اس میں سو روپے کا ہیرے کا ریزہ بھی ہوتا ہے اور دو پیسے کا پیچ بھی۔ الگ الگ دیکھئے تو ہیرے کے مقابلے میں پیچ کی کوئی اہمیت اور قیمت نہیں ہوتی۔ لیکن گھڑی کے اندر پیچ کی اہمیت اس قدر ہوتی ہے کہ وہ اگر ذرا ڈھیلا ہوجائے اور اپنا کام چھوڑ دے تو ساری گھڑہ بیکار ہوجاتی ہے اور بڑے سے بڑے پرزے کی اہمیت بھی کچھ نہیں رہتی۔ جب مختلف افراد باہمی جذب سے اُمت بنتے ہیں تو جو شخص چھوٹے سے چھوٹا کام کرے اس کی اہمیت بھی باقی پرزوں کے برابر ہوتی ہے۔ یہ ہندوؤں کا مذہب ہے جس میں برہمن کی عزت اور اہمیت الگ ہوتی ہے اور کھشتر ی کی الگ۔ ویش کی الگ ہوتی ہے اور شودر کی الگ۔ اسلام اس قسم کی

کوئی تفریق نہیں کرتا۔ وہ تمام افراد کو ایک اُمت قرار دیتا ہے۔ جتنی اس امت کی قدر و منزلت ہوتی ہے اتنی ہر فرد کی قدر و منزلت ہوتی ہے۔ ان افراد کے دلی تعاون سے اُمت کا نظام قائم رہتا ہے۔ اور جیسا کہ پچھلے خطبہ میں بتایا گیا تھا، خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل اِسی نظام کے ذریعے اپنے نتائج سامنے لاتا ہے۔ یہی نظام ہے جو ظالموں کی کلائیاں مروڑ کر عدل اور انصاف کی فضا قائم کرتا ہے۔ ہمارے ہاں اگر ان ظالموں کے حوصلے دراز ہوتے چلے جاتے ہیں تو اس لئے کہ ہم ایک اُمت۔ ایک قوم کی حیثیت سے نہیں رہتے۔ افراد کی حیثیت سے رہتے ہیں۔ یاد رکھئے۔ قرآن مجید نے ہمیں ایک اُمت بنایا ہے۔ افراد کی حیثیت سے زندگی بسر کرنا مسلمان کا شیوہ نہیں۔ مسلمان اس وقت مسلمان بنتا ہے جب وہ اُمت کی مشینری کا پرزہ بن کر رہتا ہے۔ جونہی وہ اس مشینری سے الگ ہوا، اس کا قلادہ اس کی گردن سے اتر گیا۔

آئندہ خطبات میں یہ بتایا جائے گا کہ قرآنِ مجید کی رُو سے مختلف افراد ایک اُمت کس طرح بنتے ہیں۔ اور اس اُمت کا فریضۂ زندگی کیا ہے۔ والسلام

پانچواں خطبہ:

افراد، قوم کس طرح بنتے ہیں

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۣ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (3:200)

ارشادِ خداوندی ہے کہ اے افرادِ جماعتِ مومنین۔ تم خود بھی ثابت قدم رہو۔ اور دوسروں کو ثابت قدم رہنے کی تلقین کرو۔ ایک دوسرے کے ساتھ جُڑے رہو۔ اور (اس طرح سب مل کر) قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو۔ تقویٰ شعار بنو۔ تاکہ تم کامیاب زندگی بسر کر سکو۔

سابقہ خطبہ میں یہ بتایا گیا تھا کہ اسلامی زندگی یہ ہے کہ تمام افراد باہمی مل کر اُمت بن جائیں۔ اسلامی زندگی اُمت یا قوم بن کر رہنے کی زندگی ہے۔ الگ الگ رہنے اور اپنے اپنے مفاد کے پیچھے دوڑنے کی زندگی مسلمان کی زندگی نہیں۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مختلف

افراد ایک قوم کس طرح بنتے ہیں۔ الگ الگ مسلمان ایک اُمت کے دھاگے میں کس طرح پروئے جاتے ہیں۔ آج ہم اس اہم حقیقت کو آپ کے سامنے بیان کریں گے۔

آپ نے کبھی فٹ بال کا میچ دیکھا ہے؟ ضرور دیکھا ہوگا۔ اس میں ایک طرف گیارہ کھلاڑی ہوتے ہیں۔ یہ سب کھلاڑی میدان کے آدھے حصے میں بکھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ کوئی پیچھے، کوئی آگے۔ کوئی درمیان میں، کوئی دائیں، کوئی بائیں۔ کوئی سب سے اخیر ایک جگہ اکیلا کھڑا دکھائی دے گا۔ وہ اس طرح بکھرے ہوئے ہوتے ہیں، جیسے ایک کو دوسرے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ اتنے میں سیٹی بجتی ہے اور بال میدان میں آجاتا ہے۔ یہ بکھرے ہوئے کھلاڑی بڑی تیزی سے بھاگنا شروع کر دیتے ہیں۔ میدان میں عجیب ہلچل مچ جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا افراتفری کا عالم ہے۔ لیکن اس افراتفری اور ہلچل میں ایک چیز عجیب دکھائی دیتی ہے اور وہ یہ کہ ان میں سے جس کے قریب بھی بال آجاتا ہے وہ اسے ایک خاص سمت کی طرف لے جانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ ان میں سے ایک کھلاڑی بال کو مشرق کی طرف لے جائے اور دوسرے کی باری آئے تو وہ اسے مغرب کی طرف لے جائے۔ جس سمت کو یہ سب کھلاڑی بال کو لے جانا چاہتے ہیں، اُسے انگریزی زبان میں گول کہتے ہیں۔ گول کے معنی نصب العین، منزلِ مقصود۔ وہ نقطہ جس پر سب کی نگاہ ہو۔ وہ چیز جسے سب مل کر حاصل کرنا چاہیں۔ کھلاڑی گیارہ ہوتے ہیں لیکن ان سب کے سامنے گول ایک ہی ہوتا ہے۔ جن کھلاڑیوں کے سامنے ایک مشترکہ گول ہو انہیں انگریزی زبان میں ٹیم کہتے ہیں۔

اسی طرح جب کسی جگہ کے رہنے والے انسانوں کے سامنے ایک مشترکہ نصب العین ہو تو انہیں قوم یا اُمت کہا جاتا ہے۔ لہٰذا، افراد اس صورت میں قوم بن سکتے ہیں جب ان سب کے سامنے ایک گول۔ ایک نصب العین یا ایک منزلِ مقصود ہو۔ اگر کسی ملک کے باشندوں کے سامنے ایک نصب العین نہ ہو تو وہ قوم نہیں بن سکتے۔ یا مختلف لوگوں کے سامنے مختلف نصب العین ہوں تو بھی وہ ایک قوم نہیں بن سکتے۔

دنیا کے مختلف ملکوں کے رہنے والے اپنے سامنے مختلف نصب العین رکھتے ہیں اور اس طرح

ایک ملک کے باشندے ایک قوم بن جاتے ہیں۔لیکن مسلمانوں کا نصب العین خود ان کے خدا نے مقرر کر دیا ہے۔ اس نے ان سے کہا ہے کہ: وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠ (3:103) تم سب مل کر۔ اکٹھے ہو کر۔ اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے تھامے رکھو (یہی تم سب کا نصب العین ہے۔ اس نصب العین کی وحدت سے تم ایک اُمت بنتے ہو۔ اس لئے تم الگ الگ نصب العین سامنے رکھ کر) مختلف گروہ نہ بن جاؤ۔ یہ ''اللہ کی رسی'' جس سے مسلمان ایک اُمت بنتے ہیں اس کی کتاب یعنی قرآن مجید ہے۔ یہی وہ گول ہے جس کی طرف ہر مسلمان کا رُخ ہونا چاہئے۔ یہی وہ منزلِ مقصود ہے جس کی طرف ان سب کا قدم اٹھنا چاہئے اسی وحدتِ نصب العین کا نام توحید ہے۔ کھیل کے میدان میں جن گیارہ کھلاڑیوں کا گول ایک ہوتا ہے انہیں ایک ٹیم کہا جاتا ہے۔ ان کے مقابلہ میں دوسرے کھلاڑیوں کا گول ان سے مختلف ہوتا ہے۔ وہ دوسری ٹیم کہلاتے ہیں۔ آپ نے غور کیا کہ ایک ہی میدان کے کھلاڑی دو گروہ کس طرح بن گئے؟ محض گول کے الگ الگ ہونے سے۔ موجودہ زمانے کی اصطلاح میں قوم کے نصب العین یا گول کو آئیڈیالوجی کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان، آئیڈیالوجی کی وحدت کی بناء پر اُمت بنتے ہیں۔ ان سب کی آئیڈیالوجی ایک ہوتی ہے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے اسی کا نام توحید ہے۔ اگر ان کی آئیڈیالوجی مختلف ہو جائے تو اسے شرک کہیں گے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان سے کہا ہے کہ: وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ۭ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ۝ (3:31-32) اے مسلمانو! دیکھنا تم کہیں (مومن ہونے کے بعد پھر) مشرک نہ بن جانا۔ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کر لئے اور خود بھی ایک گروہ بن بیٹھے۔ پھر ان میں سے ہر ایک فرقے کی یہ حالت ہو گئی کہ وہ اپنے طریقہ (کو حق سمجھ کر اس) میں مگن ہو گیا۔ آپ نے غور کیا کہ قرآن نے کس طرح نصب العین کی وحدت کو توحید اور نصب العین کے اختلاف کو شرک قرار دیا ہے۔ یہ اس لئے کہ مسلمان ایک اُمت بنتے ہی نصب العین کی وحدت سے ہیں۔ جب مختلف گروہوں کے سامنے نصب العین مختلف ہو گئے تو ایک دوسرے سے الگ الگ ہو گئے۔ یہ

ایک اُمت نہ رہے۔ ان کی وحدت ٹوٹ گئی۔ ان میں توحید کی جگہ شرک آ گیا۔ مسلمانوں کا نصب العین قرآنِ کریم ہے۔ وہ ایک ایسی کتاب ہے جس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ اسی سے مسلمان ایک اُمت بنتے ہیں۔ یہی ہماری آئیڈیالوجی ہے۔ اس کی خاطر ہم نے پاکستان حاصل کیا تھا۔

آپ کہیں گے کہ ان کے لئے پاکستان حاصل کرنے کی ضرورت کیا تھی؟ قرآنِ کریم ہمارے پاس اس وقت بھی موجود تھا۔ جب ہم متحدہ ہندوستان میں رہتے تھے۔ یہ ٹھیک ہے۔ لیکن اس وقت ہم قرآنِ کریم پر عمل نہیں کر سکتے تھے۔ قرآنِ کریم زندگی کا ضابطہ ہے۔ یہ قانون کی کتاب ہے۔ جیسا کہ پہلے خطبہ میں بتایا گیا تھا، اس میں خدا نے مستقل اقدار یا نہ بدلنے والے اصول دیئے ہیں تا کہ ہم ان کے مطابق زندگی بسر کریں۔ لیکن ان اصولوں کے مطابق زندگی بسر نہیں ہو سکتی جب تک اپنی حکومت نہ ہو۔ ہم نے اسی مقصد کے لئے پاکستان کا مطالبہ کیا تھا کہ ہم اپنی مملکت میں قرآنِ کریم کی مستقل اقدار کو قانون بنا کر نافذ کر سکیں اور اس طرح اپنی زندگی کو اس کے قالب میں ڈھال سکیں۔ قرآنِ کریم نے مومن اور کافر میں فرق ہی یہ بتایا ہے کہ مومن وہ ہیں جو قرآن کریم کے مطابق حکومت قائم کرتے ہیں۔ جو ایسا نہیں کرتے وہ کافر ہیں: وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۴۴﴾ (5:44) جو خدا کی نازل کردہ کتاب کے مطابق فیصلے نہیں کرتے۔ سو وہی لوگ کافر ہیں۔

مومن کے معنی ہیں ماننے والا اور کافر کے معنی ہیں نہ ماننے والا۔ انکار کرنے والا۔ یعنی جو لوگ قرآنِ کریم کو بطور نصب العین یا آئیڈیالوجی کے مانتے ہیں اور پھر اسی کے مطابق مملکت قائم کرتے ہیں، وہ مومن ہیں۔ جو لوگ قرآنِ کریم کو اپنی زندگی کا نصب العین یا آئیڈیالوجی نہیں مانتے اور اس کے مطابق مملکت قائم نہیں کرتے وہ مومن نہیں کافر ہیں۔

ان تصریحات سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آ گئی کہ:

(1) افراد اس وقت تک قوم نہیں بنتے جب تک ان کے سامنے ایک گول۔ ایک نصب العین یا ایک آئیڈیالوجی نہ ہو۔

(2) جولوگ قرآنِ کریم کو اپنی زندگی کا نصب العین مانتے ہیں، انہیں مسلمان کہتے ہیں اور وہ اس نصب العین کی وحدت سے ایک قوم یا اُمت بنتے ہیں۔

(3) قرآنِ کریم کو زندگی کا نصب العین رکھنے سے مطلب یہ ہے کہ اس کے مطابق حکومت قائم کی جائے۔

(4) ہم نے اسی مقصد کے لئے پاکستان کا مطالبہ کیا تھا اور اس کے لئے اُسے حاصل کیا تھا۔ لیکن پاکستان حاصل کرنے کے بعد ہم بالکل بھول گئے کہ ہماری آئیڈیالوجی کیا ہے۔ ہمارا نصب العین کیا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ جب لوگوں کو اپنا نصب العین ہی یاد نہ رہے تو وہ افراد کی حیثیت سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ ایک قوم کبھی نہیں بنتے۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ ہم پاکستان بننے کے بعد، ایک قوم بنے ہی نہیں۔ ہم میں اجتماعی زندگی آئی ہی نہیں۔ ہم ایک ٹیم کی حیثیت سے میدانِ عمل میں اُترے ہی نہیں۔ ہم میں سے کسی کھلاڑی کو پتہ ہی نہیں کہ اس کا گول کون سا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم میں سے ایک کھلاڑی کی کک ایک طرف کو لگتی رہی ہے اور دوسرے کی دوسری طرف کو۔ یہ وجہ ہے کہ ہم زندگی کے میدان میں کوئی بازی نہیں جیت سکے۔

لیکن اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ پاکستان کی سرزمین ہمارے پاس ہے اور اللہ کا شکر ہے کہ بالکل محفوظ شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔ ہماری آئیڈیالوجی، یعنی قرآنِ مجید ہمارے پاس موجود ہے اور وہ بھی بالکل محفوظ شکل میں موجود ہے۔ ضرورت صرف اس کی ہے کہ ہم اسے اپنی حکومت کا نصب العین بنالیں۔ اس سے ہم ایک اُمت بھی بن جائیں گے اور صحیح اسلامی زندگی بھی بسر کرسکیں گے۔

چھٹا خطبہ:

حکومت تمام اُمت کی ہوتی ہے

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ط ۔۔۔(3:109)

ترجمہ: تم سب سے اچھی اُمت (قوم) ہو جسے نوعِ انسانی کی بھلائی کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ تم اچھے کاموں کا حکم دیتے ہو اور بُرے کاموں سے روکتے ہو۔ اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

پچھلے خطبہ میں یہ بتایا گیا تھا کہ افراد، اس وقت قوم بنتے ہیں جب ان سب کے سامنے ایک نصب العین ہو۔ اسے کھیل کی مثال سے سمجھایا گیا تھا جس میں گیارہ کھلاڑی ہوتے ہیں اور ان سب کے سامنے ایک گھول ہوتا ہے۔ ہم نے یہ بھی بتایا تھا کہ ان کھلاڑیوں میں سے کوئی دائیں کی طرف ہوتا ہے کوئی بائیں کی طرف، کوئی آگے، کوئی پیچھے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ ان کھلاڑیوں کی اپنی اپنی مرضی پر موقوف ہوتا ہے کہ جس کا جہاں جی چاہے کھڑا ہو جائے اور جو کچھ جی میں آئے کرنے لگ جائے؟ ظاہر ہے کہ اس طرح بڑی ہڑ بونگ مچ جائے گی۔ کھیل کے میدان میں عجیب بے ہنگم قسم کی افراتفری پھیل جائے گی۔ ایک ہی ٹیم کے کھلاڑیوں میں جھگڑے شروع ہو جائیں گے۔ جہاں ایک کھلاڑی کھڑا ہے وہاں دوسرا کھلاڑی کھڑا ہونا چاہے۔ وہ اپنی جگہ چھوڑنا نہ چاہے۔ یہ اس کی جگہ لینا چاہے۔ دونوں میں دھینگا مشتی شروع ہو جائے۔ بجائے اس کے کہ یہ دوسری ٹیم کا مقابلہ کریں، خود آپس میں ہی الجھتے رہیں۔ ایسی صورت سے بچنے کے لئے یہ کھلاڑی اپنے میں سے سب سے اچھے کھلاڑی کو اپنا کپتان چن لیتے ہیں اور یہ عہد کر لیتے ہیں کہ وہ سب اس کپتان کی بات مانیں گے۔ اس بات کا فیصلہ کپتان کرتا ہے کہ کون کھلاڑی کس جگہ کھڑا ہو۔ کس کے ذمے کس قسم کا کام لگایا جائے۔ یہی ان سب کی ڈیوٹیاں لگاتا ہے۔ یہی ان کے جھگڑوں کے فیصلے کرتا ہے۔ اس طرح یہ کھلاڑی ایک ٹیم بنتے ہیں۔

جو صورت کھلاڑیوں کی ہے وہی ایک قوم یا اُمت کی ہے۔ اُمت کے افراد کبھی اُمت کی شکل میں نہیں رہ سکتے اگر ان کا کوئی کپتان نہ ہو۔ اُمت کے افراد اپنے میں سے بہترین فرد کو چن کر اپنا بڑا مان لیتے ہیں اور سب اس کی ہدایات کے مطابق چلتے ہیں۔ اس سے ان میں باہمی نظم اور ضبط قائم رہتا ہے۔ اس سے وہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنے کے اہل بنتے اور اپنی منزلِ مقصود تک پہنچتے ہیں۔ قوم کے اس بڑے فرد کو آج کل کی اصطلاح میں صدرِ مملکت یا (Head of The State) کہتے ہیں۔ یعنی مملکت کا سربراہ۔ ہماری اصطلاح میں اُسے

خلیفۃ المسلمین یا امیر المومنین کہا جاتا ہے۔ سوال اصطلاح کا نہیں۔ حقیقت کا ہے، اور حقیقت یہی ہے کہ وہ اُمت کا بہترین فرد۔ اُمت کا چنا ہوا۔ اُمت کی ٹیم کا کپتان ہوتا ہے۔

ٹیم اور اس کے کپتان۔ یا قوم اور مملکت کے سربراہ کا معاملہ عجیب ہوتا ہے۔ ٹیم کا کپتان، ٹیم سے باہر کھڑا ہو کر حکم نہیں چلاتا۔ وہ گیارہ کھلاڑیوں میں سے ایک کھلاڑی ہوتا ہے۔ وہ انہی کی طرح ٹیم کے اندر ٹیم کے ساتھ مل کر کھیلتا ہے۔ وہ جب ڈیوٹیاں تقسیم کرتا ہے تو اپنے ذمے بھی ایک ڈیوٹی لیتا ہے۔ وہ اس ڈیوٹی کو ایک عام کھلاڑی کی طرح سرانجام دیتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ساری ٹیم کو مناسب ہدایات بھی دیتا رہتا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو ٹیم کے کپتان کو دُہرے فرائض سرانجام دینے پڑتے ہیں۔ یہی حالت اُمت کے سربراہ کی ہے۔ وہ اُمت کا ایک فرد۔ یا یوں سمجھئے کہ مملکتِ پاکستان کا ایک عام شہری ہوتا ہے اور اس کے ذمے وہ تمام فرائض ہوتے ہیں جو دوسرے شہریوں کے ذمے ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ اس کے ذمے یہ کام بھی ہوتا ہے کہ وہ ساری قوم کی سربراہی کرے۔ انہیں مناسب ہدایات دے اور اس کا اطمینان کرے کہ ہر فرد اپنا اپنا فریضہ صحیح طور پر ادا کر رہا ہے۔ اس لئے اُسے باقیوں کے مقابلہ میں کئی گنا زیادہ کام کرنا پڑتا ہے۔

لیکن کپتان مقرر کر لینے کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ باقی کھلاڑی اطمینان سے بیٹھ جائیں اور سمجھ لیں کہ سارا کام کپتان خود ہی کرے گا۔ وہی گول کرے گا اور وہی اکیلا مقابل ٹیم کو شکست دیدے گا۔ بالکل نہیں۔ جب تک ٹیم کا ہر ایک کھلاڑی اپنی اپنی ڈیوٹی صحیح طور پر سرانجام نہیں دے گا۔ ٹیم کبھی جیت نہیں سکے گی۔ اور کوئی کھلاڑی اپنی ڈیوٹی صحیح طور پر سرانجام نہیں دے سکتا جب تک وہ کپتان کی ہدایات کی اطاعت نہ کرے۔ لہٰذا

(1) ٹیم کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے میں سے بہترین فرد کو اپنا کپتان چُنے۔

(2) کپتان کا کام یہ ہے کہ وہ ٹیم کو بہترین ہدایات دے اور

(3) ٹیم کے ہر کھلاڑی کا کام یہ ہے کہ وہ کپتان کی ہدایت کے مطابق اپنا فریضہ سرانجام دینے میں پوری پوری کوشش کرے۔

جو ٹیم اس طرح کرے گی وہ کامیاب ہو جائے گی۔ پھر یہ چیز بھی قابلِ غور ہے کہ ٹیم کی جیت، کپتان کی جیت اور ٹیم کی ہار کپتان کی ہار نہیں کہلاتی۔ جیتتی بھی ٹیم ہے اور ہارتی بھی ٹیم ہے۔ یہی حالت قوم کی ہے۔ اگر کوئی قوم اپنا سربراہ اچھا نہیں چنتی۔ اگر وہ سربراہ صحیح ہدایات نہیں دیتا۔ اگر قوم کے افراد اپنے سربراہ کی ہدایات کی اطاعت نہیں کرتے تو زندگی کے میدان میں اس قوم کو مخالف اقوام کے مقابلہ میں شکست ہو جاتی ہے۔ یہ شکست ساری قوم کی ہوتی ہے۔ جس طرح جیت ساری قوم کی جیت ہوتی ہے۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ قوم کا سربراہ جو فیصلے کرتا ہے وہ اس کے ذاتی فیصلے نہیں ہوتے بلکہ ساری قوم پر ان کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ وہ ساری قوم کے فیصلے ہوتے ہیں۔ قوم کا سربراہ جو معاہدات دوسری اقوام سے کرتا ہے وہ بھی اس کے ذاتی معاہدات نہیں ہوتے۔ ان کی ذمہ داری پوری قوم پر عائد ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُمتِ مسلمہ کے متعلق قرآنِ کریم کہتا ہے کہ: وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۪ (42:38)۔ ان کی حکومت باہمی مشورہ سے ہوتی ہے اور اسی لئے، جیسا کہ اُس آیت میں کہا گیا ہے جو شروع میں تلاوت کی گئی ہے، قرآنِ کریم نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر (یعنی بھلائیوں کے حکم دینے اور برائیوں سے روکنے) کا فریضہ، ساری اُمت کا قرار دیا ہے۔ صرف اُمت کے سربراہ کا فریضہ قرار نہیں دیا۔ گویا ایک اسلامی حکومت کی طرف سے جس قدر احکامات نافذ ہوتے ہیں، وہ ساری اُمت کی طرف سے نافذ شدہ احکام سمجھے جاتے ہیں۔ وہ حکومت ساری اُمت کی ہوتی ہے۔ کسی خاص گروہ یا خاص فرد کی حکومت نہیں ہوتی۔

اس ضمن میں ایک اہم بات اور بھی قابلِ غور ہے۔ کیا ٹیم کے کپتان کو اس کا حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ جس قسم کا حکم جی میں آئے دیدے یا اس پر بھی کوئی پابندی عائد ہوتی ہے؟ اس بات کے سمجھنے کے لئے ایک فٹ بال کے کھیل کو پھر سے سامنے لائیے۔ اس میں ایک قاعدہ یہ ہے کہ بال کو ہاتھ نہ لگنے پائے۔ اگر کسی کھلاڑی کا بال کو ہاتھ لگ گیا تو وہ مجرم سمجھا جائے گا۔ ٹیم کے کپتان کو اس کا حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ کسی کھلاڑی سے یہ کہہ دے کہ تم بال کو ہاتھ سے بھی چھو

سکتے ہو۔ وہ ایسا کبھی نہیں کرسکتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کپتان کے اختیارات اُن قاعدوں کے ماتحت ہوتے ہیں جو کھیل کے لئے بطور اصول اختیار کئے جاتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے خطبہ میں بتایا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں ایسی مستقل اقدار یا اصول دیئے ہیں جن میں کبھی ردوبدل نہیں ہوسکتا۔ اسلامی مملکت ان مستقل اقدار یا نہ بدلنے والے اصولوں کو عملاً نافذ کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے۔ اس لئے اسلامی مملکت کے سربراہ کو اس کا حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ ان اصولوں میں کسی قسم کا ردوبدل کرسکے یا ان کے خلاف کوئی حکم نافذ کرسکے۔ وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ (6:34)۔ خدا کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں۔ اس لئے حکومت کا سربراہ یا کوئی اور، نہ تو ان مستقل اصولوں میں کوئی ردوبدل کرسکتا ہے اور نہ ہی ان کے خلاف کوئی حکم دے سکتا ہے۔ یہ زندگی کے میدان کے اٹل قانون ہیں۔ ان کی پابندی ہر حال میں ضروری ہوتی ہے۔

ایک بات اور بھی قابلِ غور ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے، فٹ بال کے کھیل کا ایک قاعدہ یہ ہے کہ بال کو کسی کا ہاتھ نہیں لگنا چاہئے۔ اس قاعدے سے کوئی مستثنیٰ نہیں ہوتا۔ یعنی یہ نہیں ہوسکتا کہ کھلاڑیوں کو تو اس کی اجازت نہ ہو کہ وہ بال کو ہاتھ لگا سکیں لیکن کپتان کا جی چاہے تو بال کو پاؤں سے کک لگادے اور جی چاہے تو ہاتھ سے پکڑ لے۔ بالکل نہیں، قاعدے کی پابندی ہر ایک کو یکساں طور پر کرنی ہوتی ہے۔ یہی صورت اسلامی حکومت کی ہے۔ اس میں خدا کے مقرر کردہ اصول ہر ایک پر یکساں طور پر نافذ ہوتے ہیں۔ مملکت کی بڑی سے بڑی ہستی بھی ان اصولوں سے بالا نہیں ہوتی۔ اور تو اور، خود حضور نبی اکرم ﷺ کی زبانِ مبارک سے کہلوا دیا گیا کہ: اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ (6:163)۔ ''میں اُن میں سب سے پہلا ہوں جو قوانینِ خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے والے ہیں۔''

اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ اسلامی مملکت میں، مملکت کے سربراہ کو باقی افرادِ اُمت کے مقابلہ میں کوئی خصوصیت یا رعایت حاصل نہیں۔ وہ خدا کے مقرر کئے ہوئے اصولوں میں ردوبدل نہیں کرسکتا۔ وہ ان کے خلاف کوئی حکم صادر نہیں کرسکتا۔ اسے سب سے پہلے ان قوانین کی اطاعت کرنی ہوتی ہے۔ وہ اگر ان کی خلاف ورزی کرے تو اس سے بھی اسی

قسم کا مواخذہ ہوگا جس قسم کا مواخذہ قوم کے ایک عام فرد سے ہوگا۔ اور اسے بھی اُسی قسم کی سزا ملے گی۔ چنانچہ خود حضور رسالت مآب ﷺ کی طرف سے اعلان کر دیا گیا کہ: قُلْ اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ﴿۱۵﴾ (6:15) ان سے کہہ دو کہ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو میں ایک بڑے دن (یعنی مکافاتِ عمل کے وقت) سے ڈرتا ہوں۔

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ اسلامی مملکت میں:

(1) افرادِ اُمت اپنے میں سے بہترین فرد کو اپنا سربراہ چُن لیتے ہیں۔

(2) وہ سربراہ مملکت کے تمام اختلافی معاملات طے کرتا ہے۔

(3) افرادِ اُمت پر اس کے فیصلوں کی پابندی ضروری ہوتی ہے۔

(4) لیکن وہ اپنے فیصلوں میں ڈکٹیٹر نہیں ہوتا۔ اُسے ان اصولوں کی پابندی کرنی ہوتی ہے جو خدا کی طرف سے قرآنِ کریم میں دیئے گئے ہیں۔

(5) اس بارے میں اس میں اور ایک عام فرد اُمت میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

اس اعتبار سے دیکھئے تو اسلامی حکومت کسی فرد یا کسی گروہ کی حکومت نہیں ہوتی۔ وہ ساری کی ساری قوم (یا اُمت) کی حکومت ہوتی ہے۔ اور اس میں تمام فیصلے، احکام اور قوانین، خدا کے مقرر کردہ اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے مرتب ہوتے ہیں۔ ان کی خلاف ورزی کوئی نہیں کرسکتا۔ اس طرزِ حکومت کا اثر دنیا کے دوسرے انسانوں پر کیا پڑتا ہے اور یہ حکومت باقی حکومتوں کے مقابلہ میں سب سے اچھی کیوں ہوتی ہے۔ اس کی بابت کبھی پھر بتایا جائے گا۔ والسلام

(مطبوعہ ماہنامہ طلوع اسلام 1979ء)